فن حدیث میں منہاج تحقیق

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

قرآن کے بعد حدیث اسلامی شریعت کا دوسرا بنیادی ماخذ اور اسلامی تہذیب کا تفصیلی سرچشمہ ہے۔حدیث کتاب اللہ کی تشریح وتعبیر کے ساتھ اپنا مستقل تشریعی مقام رکھتی ہے۔ان دونوں پہلوؤں کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر حدیث میں تحقیقی کام کا رجحان اور میدان وسیع رہا ہے۔محدثین نے نقدِ حدیث کے جو اصول وضع کئے اور ان کے ساتھ فن اسماء الرجال کو جو ترقی دی وہ دوسرے شعبہ ہائے علم کے طریقِ تحقیق میں بھی رہ نما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔حدیث میں تنقید وتحقیق کا طریقہ آج بھی نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔اور جدید زمانے کی اعلیٰ سے اعلیٰ تاریخی تنقید بھی مشکل ہی سے اس پر کوئی اضافہ کرسکتی ہے۔ایک محقق کے بہ قول محدثین کے اصول تنقید اپنے اندر ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھتے ہیں جن تک موجودہ زمانے کے ناقدین کا ذہن بھی ابھی تک نہیں پہنچا۔نیز دنیا میں صرف محمد ﷺ کی سنت وسیرت اور ان کے دور کی تاریخ کا ریکارڈ ہی ایسا ہے جو اس کڑی تنقید کے معیاروں پر کسا جانا برداشت کرسکتا تھا جو محدثین نے اختیار کی ہے۔(۱)

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی یہاں تک کہتے ہیں محدثین ہی نے دنیا کی ساری قوموں کے مقابلے میں سب سے پہلے اخبار وروایات کی علمی تحقیق وتنقید کے قواعد وضوابط مقرر کئے۔(۲)

قرآن بنیاد تحقیق ہے

اس طریقِ تحقیق کی بنیاد خود قرآن کریم نے فراہم کی ہے، چناں چہ ارشاد باری ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنْ جَاءَ كُمْ فَا سِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَا لَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ o (۳)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کئے

پر پشیمان ہو۔

اس آیت میں تحقیق کا حکم خبر اور خبر لانے والے دونوں سے متعلق ہے اور یہیں سے فن حدیث میں روایت اور درایت کے اصول یعنی حدیث کی سند اور متن کی تحقیق میں رہ نمائی فراہم ہوتی ہے۔

نیز قرآن کریم کی حسب ذیل آیت بھی اسلامی تحقیق کے منہاج کو متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

وَاِذَاجَاءَ هُمْ اَمْرٌمِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْابِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّ سُوْلِ وَاِلٰى اُوْلِى الْاَمْرِمِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴)

یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوف ناک خبر سن پاتے ہیں اسے لے کر پھیلا دیتے ہیں، حال آں کہ اگر یہ اسے رسول یا اپنی جماعت کے ذمے دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرسکیں۔

قرآن چوں کہ اندھی عقیدت اور تقلیدِ جامد کا مخالف ہے اس لئے وہ تحقیق وتنقید اور حق شناسی کو صحت مند اور متحرک علمی زندگی کے لئے لازم قرار دیتا ہے بل کہ عقیدے جیسے نازک مسائل کو بھی عقل وتحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

حدیث بھی بنیاد تحقیق ہے

حدیث کی تحقیق وتنقید اور چھان بین کی روایت کو فروغ دینے میں خود نبی ﷺ کی تعلیمات کو بڑا دخل ہے۔آپ ﷺ نے اگر ایک طرف حدیث کو یاد کرنے اور اس کی حفاظت واشاعت کی فضیلت بیان فرمائی اور ایسے لوگوں کے لئے جو اس مقدس علمی کام میں اپنا وقت لگائیں دعائیں دیں اور خوش خبریاں سنائیں تو دوسری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرنے پر سخت وعید بھی سنائی۔

آپ نے فرمایا:

من كذب علي متعمدا فليتبوا مقعده من النار (۵)

جس نے جان بوجھ کر میری جانب کوئی جھوٹی بات منسوب کی تو اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

چوں کہ آپ ﷺ کا معاملہ عام انسانوں سے مختلف ہے بہ ایں معنی کہ آپ کی ہر بات اپنا تشریعی وزن رکھتی ہے اور آپ کی سنت سرچشمۂ ہدایت اور اساسِ دین ہے اس لئے کوئی بات آپ کی طرف کبھی ایسی منسوب نہیں ہونی چاہئے جو آپ نے نہیں کہی ورنہ دین کے نام پر بے دینی کی اشاعت عمل میں آئے گی، چناں چہ آپ ﷺ نے خود ہی فرمایا:

ان کذبا علی لیس ککذب علی احد من کذب علی متعمد افلیتبوأ مقعده من النار (٦)

میری جانب کوئی جھوٹی بات منسوب کرنا ایسا نہیں جیسے کسی عام شخص کی جانب کوئی جھوٹی بات منسوب کردی جائے، جس نے جان بوجھ کر میری جانب کوئی جھوٹی بات منسوب کی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

اس کے نتیجے میں محدثین اور اصولیین حدیث کے قبول و اشاعت کے معاملے میں نہایت حساس اور محتاط ہوگئے اور پھر انہوں نے صحت و سقم کو پرکھنے کے لئے ایسی کسوٹیاں بنائیں کہ عام انسانی تاریخ اور علوم وفنون کے معیار سے ہزار ہا درجہ سخت اور بلند کہی جاسکتی ہیں۔ اور یہ علمی تحقیق کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

صحابہ کرام نے اس طریقہ تحقیق کو اپنایا، صحابہ کرامؓ جنہوں نے حالت ایمان میں نبی اکرم ﷺ کو دیکھا اور اسی پر ان کا انتقال ہوا۔ ہمارے نزدیک امت کے بہترین لوگ ہیں اور وہ صادق و عادل ہیں وہ اپنے باہمی معاملات میں جھوٹ نہیں بولتے تھے جن میں نفع ونقصان کا سا پہلو ہوتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں وہ گویا ہلاک ہونا زیادہ پسند کرتے بہ جائے اس کے کہ کوئی جھوٹی بات آپ کی طرف منسوب کریں۔ چناں چہ حضرت علی فرماتے ہیں میں جب تم لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کروں تو مجھے آسمان سے گر جانا پسند ہے۔ مگر آپ کی طرف جھوٹ کا انتساب پسند نہیں۔ (٧)

مگر جھوٹ اور غلط بیانی سے احتیاط کرنے کے باوجود اس بات کا پورا احتمال موجود ہے کہ نبی ﷺ سے حدیث سننے میں، مفہوم کو سمجھنے میں یا موقع ومحل کو متعین کرنے میں کسی صحابی کو غلط فہمی ہوگئی ہو، اس لئے یہاں تحقیق کے دونوں اصولوں روایت اور درایت سے کام لیا گیا۔ مثال کے طور پر حضرت ابو ہریرۃؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کیا کہ گھر عورت اور سواری میں نحوست اور بدبختی پائی جاتی ہے۔ یہ بات جب حضرت عائشہؓ کو معلوم ہوئی تو انہوں نے کہا

ابوہریرہؓ نے پوری بات نہیں سنی آپ ﷺ یہود پر لعنت کر رہے تھے کہ وہ عورت، گھر اور سواری میں بدبختی کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ابوہریرہؓ نے پوری بات نہیں سنی اور آخری جملے کو آپ کا قول بتا دیا۔(۸)

حضرت ابوہریرہؓ کی عدالت و ثقافت میں کوئی کلام نہیں مگر انھوں نے غلط فہمی کی بنیاد پر یہود کے عقیدے کو نبی کریم ﷺ کا قول بتا دیا۔ حضرت عمرؓ سے حضرت فاطمہ بنت قیس نے کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفقہ اور سکنی کا حکم نہیں دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں ایک عورت کی وجہ سے کلام اللہ اور سنت رسول اللہ نہیں چھوڑ سکتا، کیا پتہ اس نے اس کو صحیح طریقے سے محفوظ رکھا یا بھول گئی۔(۹)

خلفائے اربعہ حدیث بیان کرنے والوں سے شہادت اور قسم اس لئے طلب کرتے تھے کہ حدیث کی قطعیت پایۂ ثبوت تک پہنچ جائے۔ اس طرح کی مثالیں بتاتی ہیں کہ خود صحابہ نے علم کے طریق تحقیق کو نہ صرف اپنایا، بل کہ حدیث کے اخذ و قبول میں اسے پوری طرح لاگو کیا۔

روایت اور درایت

حدیث کی تحقیق و تنقید کے لئے عام طور پر دو قسم کے طریقہ کار وضع کئے گئے۔ پہلا طریقہ تحقیقِ روایت ہے۔ یہ طریقہ تحقیق زیادہ عام اور مشہور رہا ہے اور حدیث کی تحقیق میں زیادہ تر اسی سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں حدیث کے اصول جرح و تعدیل، اسماء الرجال، علل اسناد، راوی کی اخلاقی و دینی حالت، حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت، اعتقادی و فکری کی کیفیت وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اس اصول تحقیق کی رو سے حدیث کو دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ متواتر اور آحاد۔

متواتر وہ احادیث ہیں جن کے راوی ہر دور میں اتنی تعداد میں رہے ہوں کہ ان سب کا کسی غلط بات پر اتفاق کرنا مشکل ہو، حدیث متواتر میں اگر قولی روایات کو لیا جائے تو ایسی احادیث بہت کم ہیں، لیکن اگر عملی روایات یعنی تعامل و توارث کو لیا جائے تو احادیث کا بڑا حصہ متواتر کہلانے کا مستحق ہے، چناں چہ مولانا مناظر احسن گیلانی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تاریخ کے اس عظیم الشان ذخیرہ کے ایک بڑے حصے کو میں متواتر خیال کرتا ہوں، یعنی بغیر کسی انقطاع کے لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کروڑہا کروڑ انسانوں کے ذریعے سے مشرق و مغرب میں یہ حصہ منتقل ہوتا ہوا دنیا کے موجودہ دور تک پہنچا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک پہنچتا رہے گا۔ طہارت و غسل وضو

عبادات نماز، روزہ، حج زکوٰۃ معاملات عقوبات، سیاسیات مباحات ومخطورات وغیرہ مختلف ابواب کے ان اتفاقی مسائل کا اگر انتخاب کیا جائے، جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقے کے مسلمانوں میں طبقتاً بعد طبقتاً خلفاً عن سلفٍ تواتر کے ساتھ اس حقیقت سے مسلم ہیں کہ یہی آں حضرت ﷺ کا حکم اور طرز عمل تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز نہ ہوگی۔(۱۰)

خبر واحد جس کے رواۃ متواتر سے کم ہوں محدثین کے اصول تحقیق وتنقید اور بحث وتمحیص کا زیادہ تر موضوع رہی ہے اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔مشہور

۲۔عزیز

۳۔غریب

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

علم الاسناد یبحث فیه عن صحة الحدیث وضعفه لیعمل به ا ویترك به من حیث صفات الرجال و صیغ الاد اء والمتراترلا یبحث عن رجاله بل یجب العمل به من غیر بحث (۱۱)

علم الاسناد وہ علم ہے جس میں حدیث کی صحت وضعف کی تحقیق کی جاتی ہے راویوں کے حالات معلوم کئے جاتے ہیں اور متن حدیث میں غور کیا جاتا ہے۔تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ یہ حدیث واجب العمل ہے یا لائق ترک کے اور خبر متواتر راویوں کے بارے میں بحث نہیں کی جاتی بل کہ اس پر عمل کرنا بغیر کسی بحث کے واجب ہے۔

اور اس کے لئے علم الاسناد، اسماء الرجال، روایت کی اقسام، صحیح، حسن، ضعیف مقلوب، مضطرب، مدلس، موضوع وغیرہ کے ذیلی اصول وجود میں آئے، یہ بات مسلم ہے کہ کسی بات کا وزن بیان کرنے والے کی شخصیت سے متعین ہوتا ہے اس لئے اسناد کے اصول کو حدیث کی تحقیق کے سلسلے میں سختی سے برتا گیا، صحابہ جیسے عادل وصادق حضرات کے معاملے میں سند اور تحقیق سند کی چنداں ضرورت نہ تھی اور اسی طرح بہت حد تک تابعین عظام کے معاملے میں بھی مگر جب نبی ﷺ سے ایسی روایات منسوب کی جانے لگیں جن کے متعلق آں جناب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی۔

سیکون فی آخرامتی اناس یحدثو نکم بما لم تسمعوأ انتم ولا آباؤ کم فایاکم وایا ھم (۱۲)

میری امت کے آخری زمانے میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جوتم سے ایسی ایسی چیزیں بیان کریں گے جنہیں نہ تم نے کبھی سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباواجداد نے، تم ان سے بچ کر رہنا۔

تو اسناد کی تحقیق کا طریقہ کار وضع کیا گیا۔ ابن سیرین فرماتے ہیں کہ پہلے دور میں لوگ اسناد کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے، مگر جب فتنہ پیدا ہونے لگا تو لوگ اسناد کے بارے میں تفتیش کرنے لگے۔ (۱۳) عبداللہ بن مبارک نے فرمایا:

الأسناد من الدین لولا الاسناد لقال من شاء ما شاء (۱۴)

علم الاسناد دین کا حصہ ہے، اگر یہ علم نہ ہوتا تو ہر شخص کو کھلی چھوٹ مل جاتی کہ جو چاہے کہے۔

چناں چہ محدثین نے خبر واحد کو قبول کرنے کے لئے راویوں کے لئے حسب ذیل شرطیں قرار دیں:

عقل، ضبط، عدالت اور اسلام۔

شافعی اصولیین نے مکلّف ہونے کی شرط کا اضافہ کیا ہے۔ مگر تمام علماء کے نزدیک یہ عقل ہی میں شامل ہے۔ خبر واحد کی صحت، قطعیت اور حجیت کے سلسلے میں علما کے رویے مختلف رہے ہیں۔ اور کسی قدر افراط وتفریط کا مظاہرہ بھی کیا گیا ہے۔ ایک طبقے نے اسے غیر یقینی اور ظنی الثبوت کہہ کر دین کے بڑے حصے کو غیر قطعی بنادیا اور دوسرے طبقے نے اس کے منکرین کو کافروں کی صف میں کھڑا کردیا۔ خبر واحد کی حیثیت سنت متواترہ کے درجے کی نہیں ہے۔ اس لئے اس کے منکرین کو کافر نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ وہ دین میں حجت ہیں۔

متابعات، شواہد اور اطراف

محدثین کے طریقۂ تحقیق میں خبر احاد کو قطعی الثبوت اور واجب العمل کے مقام تک پہنچانے کے لئے متابعات وشواہد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان حضرات نے یہ کوشش کی ہے کہ ایک روایت جتنے لوگوں سے مروی ہو ان سب سے بہ حد امکان حدیث سنی جائے، ایک ہی روایت

جب متعدد طریقوں سے بیان کی جاتی ہے تو اس کی صحت اور قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے محدثین اور رواۃ نے لمبے لمبے اسفار بھی کئے، بعد میں متابعات وشواہد جمع کرنے کا رجحان عام ہوتا گیا۔ چناں چہ ایک مشہور حدیث **انما الاعمال بالنیات** سات سو طریقوں سے مروی ہے۔ (۱۵)

امام مسلم اور امام ترمذی کے طریقۂ تحقیق میں اس کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ کتب حدیث میں ایک روایت کہیں اجمالاً آتی ہے اور دوسری جگہ تفصیل سے، کہیں حدیث کا ترجمۃ الباب کی مناسبت سے بیان کیا جاتا ہے۔ اور دوسری جگہ دوسرا حصہ یا تمام حصے، مختلف مقامات پر ایک حدیث کے جتنے پہلو ہوتے ہیں ان کو جمع کرنا، اطراف میں شامل ہے۔ محدثین کی یہ کوشش روایت یعنی سند کی جانچ کے لئے بھی معاون ہوتی ہے۔ اور متن کی تحقیق میں تو سب سے زیادہ کارگر ہوتی ہے۔ اسی لئے روایت کی تحقیق کے لئے کتب اطراف کا جاننا از حد ضروری سمجھا گیا ہے۔

روایات احکام میں اسناد کی سختی

حدیث کی آئینی اور تشریعی حیثیت کے پیش نظر محدثین نے احکام اور فضائل کی روایت میں قدرے فرق و امتیاز سے کام لیا ہے۔ احکام و مسائل، معاملات و عقائد وغیرہ کے باب میں جو روایات آئیں، محدثین نے ان کی اسناد کی تحقیق و تنقید میں سختی سے کام لیا مگر فضائل کے باب میں کسی قدر نرمی سے کام لیا، کیوں کہ اس کا تعلق کسی معاملے کی حلت وحرمت سے نہیں ہوتا۔ چناں چہ احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

> جب ہم رسول اللہ ﷺ سے حلال وحرام اور سنن و احکام سے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو اسناد میں سختی برتتے ہیں اور جب فضائل اعمال سے متعلق روایت کرتے ہیں تو اسناد میں نرمی اختیار کرتے ہیں۔ (۱۶)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ فضائل کے باب میں ہر طرح کی روایات قابل قبول اور قابل اشاعت ہیں، جہاں تک موضوع روایات کا تعلق ہے محدثین نے ان کی روایت کو قطعی حرام قرار دیا ہے، خواہ ان کا تعلق اعمال سے ہو یا فضائل اعمال سے البتہ ضعیف روایت کے سلسلے میں محدثین کے دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک ضعیف روایات قبول ہی نہیں کی جا سکتیں، حتی کہ فضائل میں بھی نہیں قبول کی جا سکتیں۔ ابو بکر ابن عربی وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ دوسرے محدثین نے اگرچہ فضائل کے باب میں ان کو گوارہ کیا ہے، مگر وہ کچھ شرطیں عائد کرتے

ہیں۔

۱۔شدید ضعف نہ ہو۔

۲۔کوئی مسئلہ (اصل شرعی) ثابت نہ کیا جائے۔

۳۔روایت کا ضعیف ہونا بیان کر دیا جائے اور روایات پر عمل کرتے وقت صحیح حدیث سمجھ کر عمل نہ کیا جائے بل کہ احتیاط ملحوظ رہے۔(۱۷)

ضعیف روایات کبھی درجۂ حسن کو بھی پہنچ جاتی ہیں اور کبھی موضوع بھی ثابت ہوتی ہیں۔ حافظ ابن حجر اس ضعیف کو فضائل میں قبول کرتے ہیں جو درجہ حسن کی ہو۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

شریعت میں صرف صحیح اور حسن احادیث ہی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ضعیف احادیث لینا روا نہیں، البتہ امام احمد وغیرہ بعض علماء نے فضائل اعمال میں ضعیف احادیث کی روایت جائز رکھی ہے بہ شرطے کہ ان کا جھوٹ ثابت نہ ہو گیا ہو اور یہ اس بنا پر کہ جب کوئی عمل دلیل شرعی سے ثابت ہو جائے کہ مشروع ہے اور اس کی فضیلت میں ضعیف حدیث روایت کی جائے، بہ شرطے کہ وہ جھوٹی نہ ہو تو خیال ہوتا ہے کہ ثواب درست ہو گا۔لیکن کسی امام نے بھی یہ نہیں کہا کہ ضعیف حدیث سے کوئی عمل بھی واجب یا مستحب قرار دیا جا سکتا ہے، جو کوئی یہ کہتا ہے مخالفِ اجماع ہے۔(۱۸)

امام ابن تیمیہ کے شاگرد اور محقق مفسر اور محدث علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) ضعیف روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں.

لایجوز روایتھما الا ببیان ضعفھما(۱۹)

ان دونوں کی روایت ان کا ضعف بیان کئے بغیر جائز نہیں۔

محدثین کرام نے اسناد کی تحقیق میں اس قدر احتیاط ملحوظ رکھی ہے کہ اس راہ کی ایک ایک ممکنہ کم زوری کی نشان دہی کی اور اس کا حکم بیان کیا، مثلاً راوی حدیث بیان کرتے وقت اپنے شیخ کا نام نہ لے، راوی کسی مجہول الحال آدمی سے روایت کرے، راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات ہی نہ ہو، راوی کسی شخص کو درمیان سے چھوڑ دے، راوی اپنے سے ثقہ تر راوی کی مخالفت کرے، راوی تابعی کو چھوڑ کر براہ راست صحابی سے روایت کرے، تابعی صحابی کا واسطہ چھوڑ کر رسول ﷺ سے روایت کرے وغیرہ ان سب کے بارے میں محدثین نے قطعی ضوابط

بنائے۔ اس آخری کم زوری کو لیجئے کہ تابعی صحابی کو چھوڑ کر رسول کریم ﷺ سے روایت کر دے اس کو اصطلاحِ حدیث میں مرسل کہا جاتا ہے۔ حدیث مرسل عام طور پر محدثین کے نزدیک حجت نہیں مگر امام مالک کی مراسیل اور بلغنی کے صیغے سے جو احادیث سے ذکر کرتے ہیں ان کو وزن دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ امام مالک اور نبی کریم ﷺ کے درمیان واسطے بہت کم ہیں، بل کہ بعض روایات صرف دو واسطوں یعنی حضرت نافع اور حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہیں، اس لئے اس سند کو سلسلۃ الذہب کہا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مالک اہل مدینہ کے درمیان رائج شدہ عمل کو بھی سند مانتے ہیں اور اسے حدیث کی تشریح وتعبیر میں اہمیت دیتے ہیں اس طرح مرسل روایات کو دوسری راہ سے تقویت ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب الموطا میں تقریباً ساٹھ مرسل روایات ذکر کی ہیں۔

علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ صرف چار مرسل روایات کے علاوہ تمام مراسیل کا مسند ومرفوع ہونا دوسرے طریقوں سے ثابت ہے۔ (۲۰)

سلسلۂ سند کی کم زوری

سند میں سختی برتنے کے بعد بھی اس کا امکان بہ ہر حال موجود تھا کہ کوئی بددین جھوٹی سند وضع کر کے کوئی من گھڑت روایت بیان کر دے۔ محدثین نے اس راہ کی کم زوری کا سراغ لگانے کے لئے تاریخ کا استعمال شروع کیا، مثال کے طور پر عبد بن معدان الکلاعی کا بیان ہے کہ عمر بن موسیٰ نامی راوی جب حمص آیا تو ہم اس کے پاس مسجد میں جمع ہوئے اس نے کہا مجھ سے روایت کی تمہارے صالح شیخ نے اور بار بار یہ جملہ دہرایا تو میں نے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ یہ صالح شیخ کون ہیں؟ اس نے کہا کہ خالد بن معدان ہیں، میں نے پوچھا کس سال تمہاری ملاقات ہوئی وہ بولا آرمینیہ کے جہاد میں۔ میں نے کہا: شیخ اللہ سے ڈر، خالد بن معدان ۱۰۴ھ میں وفات پا گئے اور تمہارا دعویٰ ہے کہ ان کی وفات کے چار سال بعد تم ان سے ملے۔ پھر انہوں نے روم کے جہاد میں تو حصہ لیا ہے۔ آرمینیہ کے جہاد میں کبھی شریک نہ ہوئے۔ (۲۱)

درایت

ان تمام کوششوں کے باوجود (جو راوی کی حالت کو جاننے کے لئے کی گئیں) یہ گنجائش اب بھی رہ جاتی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ایک روایت سند کے معیاروں پر پوری اترتی ہو اور کہیں کوئی ضعف

اور کم زوری نہ ہومگر وہ حدیث رسول ﷺ نہ ہو، محدثین کا زور اور ان کے اصول کا بڑا پہلو اگر چہ روایت ہی تحقیق پر ہے۔مگر انہوں نے اس کم زوری کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور اس کی گرفت کرنے کے لئے بھی تحقیق وتنقید کی کسوٹیاں بنائیں، چناں چہ قرآن کریم نے خود درایتی معیار کے استعمال کی بنیاد رکھی، مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب منافقین اور ان کے ساتھ بعض صحابہ نے تہمت لگائی تو قرآن کریم نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

لَوْلَا اِذْسَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّايَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَتَكَلَّمَ بِهٰذَاسُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌO (۲۲)

کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا ہی زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔

اس تہمت میں بعض صحابہ بھی ملوث ہو گئے تھے اگر چہ ان کی ثقاہت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا، مگر قرآن نے توجہ دلائی کہ یہ واقعہ نا قابل تسلیم تھا، تم نے پہلے ہی کیوں نہ اسے مردود ٹھہرایا۔صحابہ کرام نے بھی اس اصول تحقیق سے استفادہ کیا۔محدثین نے روایت کی جانچ کے لئے حسب ذیل درایتی معیار مقرر کئے اور کہا کہ ایسی روایت غیر معتبر ہے جن میں حسب ذیل عیوب میں سے کوئی ایک چیز موجود ہو۔

۱۔روایت عقل سلیم کے خلاف ہو

۲۔اصول مسلمہ کے خلاف ہو

۳۔محسوسات اور مشاہدے کے خلاف ہو

۴۔قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو

۵۔جس حدیث میں معمولی کام پر بے پایاں اجر اور معمولی گناہ پر عذاب الیم کی وعید ہو۔

۶۔رکیک المعنی ہو

۷۔راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات نہ ہو اور اس سے کوئی روایت نہ کرتا ہو

۸۔ایسی روایت جس سے عام لوگوں کو واقف ہونا چاہے مگر راوی کے علاوہ کسی نے روایت نہ کی ہو

۹۔ایسا واقعہ ہو جسے عوام کو جاننا چاہیے مگر صرف راوی جانتا ہو

۱۰۔روایت کلیئے کے خلاف ہو

۱۱۔روایت میں کسی قوم یا طبقے کی مذمت ہو

۱۲۔کسی پیشے یا صنعت کی مذمت ہو

۱۳۔نام، تاریخ اور مقام کے تعین کے ساتھ پیشین گوئی ہو

۱۴۔شان نبوت کے منافی ہو

۱۵۔شانِ خداوندی کے منافی ہو وغیرہ۔(۲۳)

علامہ ابن الجوزی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہر وہ روایت جو عقل کے منافی، قرآن وسنت کے مخالف اور اصول سے متناقض ہو اسے سمجھو کہ وہ غیر معتبر ہے مگر درایتی معیار بیان کرنا جتنا آسان ہے اس کو بہ روئے کار لانا اور حدیث کی تحقیق وتخریج میں اس کو بنیاد بنانا اتنا ہی مشکل ہے۔ یہ تمام اصول اگر ایک اہلِ علم کو برتنے کے لئے دے دیئے جائیں تو وہ صحیح احادیث کے بیشتر ذخیرے کو نامعتبر قرار دے گا، کیوں کہ اس کے فہم کے مطابق کوئی نہ کوئی روایت کسی معیار پر پوری نہ اتر رہی ہوگی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسماء الرجال کی طرح درایت کے استعمال کے لئے بھی حدیث کے فن میں مہارت اور طویل ممارست لازم ہے۔

علامہ ابن قیم الجوزیہ سے جب یہ سوال کیا گیا صرف درایت کی بنیاد پر کسی روایت کو موضع قرار دیا جاسکتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا:

> یہ بڑا اہم سوال ہے یہ وہی شخص جان سکتا ہے جو سنن پر حاوی ہو اور اس کے خون اور گوشت میں وہ مخلوط ہوگئی ہوں اور ان پر اسے ملکہ حاصل ہوگیا ہو، سنن اور آثار کو پہچاننے میں، رسول کی سیرت کو پہچاننے میں، رسول کرم ﷺ کے اوامر ونواہی، دعوت وخبر، پسند و ناپسند اور تعلیم وتربیت سب جان لینے میں اسے اختصاص اور مہارت حاصل ہوگئی ہو، گویا وہ حضور ﷺ کے صحابہ کرام سے ملا ہوا ہے اس قسم کا انسان آں حضور ﷺ کے افعال واحوال اور اقوال کو جان سکتا ہے۔(۲۴)

درایت کی بنیاد پر صحیح السند حدیث بھی رد کی جاسکتی ہے۔اس کی ایک مثال حدیث زہرہ ہے جسے علامہ ابن جریر طبری نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا زہرہ ایک خوب صورت عورت تھی جو ایران کی رہنے والی تھی وہ اپنا مقدمہ دو فرشتوں ہاروت و ماروت کے پاس لے گئی، ان دونوں نے اس عورت کو بدکاری کے لئے بہکایا تو عورت نے کہا یہ اسی وقت ممکن ہے

کہ تم لوگ وہ کلمہ مجھے سکھا دو جس کو پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہیں ان دونوں نے وہ کلمہ اسے سکھا دیا اور وہ اسے پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی اور اسے ستارہ زہرہ بنا دیا گیا۔ اس روایت پر نقد کرتے ہوئے علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

وهذ الاسناد رجاله ثقات وهو غريب جدا (۲۵)

اس سند کے لوگ تو ثقہ ہیں مگر روایت انتہائی غریب ہے۔

تحقیق وتخریج اور تنقید حدیث میں روایت ودرایت کا اہم پہلو یہ دیکھنا بھی ہوتا ہے کہ راوی نے جو واقعہ بیان کیا ہے یا جو قول نقل کیا ہے وہ کس حد تک واقعی اور حضور ﷺ کی منشا و مقصد کے مطابق ہے اور کس حد تک راوی کا اپنا تاثر وطرز تعبیر اس میں شامل ہے۔ کبھی واقعہ تھوڑا ہوتا ہے، مگر اس کی روایت میں راوی کا تاثر وطرز بیان اس طرح شامل ہو جاتا ہے کہ واقعہ کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ ایک موقع پر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات سے علیحدگی اختیار کی تو صحابہ کرام میں یہ خبر عام ہوگئی کہ آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ حضرت عمر یہ سن کر مسجد نبوی میں آئے تو صحابہ جمع تھے اور اس واقعے سے پریشان تھے۔ حضرت عمرؓ نبی اکرم ﷺ کے پاس گئے اور صحیح صورت حال دریافت کی تو آپ ﷺ نے طلاق دینے کی خبر کو غلط بتایا۔

محدثین اور اصولیین کے یہاں تحقیق حدیث میں ایک اور معاملہ انتہائی اہم ہے اور بڑا نازک بھی ہے وہ یہ ہے کہ کبھی روایات میں اختلاف اور تعارض کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اگر چہ احادیث میں اختلاف وتعارض کم ہے۔ لیکن کچھ روایات ایسی ضرور آتی ہیں جن میں یہ صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس معاملے میں اصولیین نے الگ الگ منہاج قائم کئے ہیں۔ جب ایک سے زیادہ روایات باہم متعارض ہوں تو امام ابو حنیفہ قدر مشترک نکالنے پر زور دیتے ہیں اور یہ بھی مشکل ہو تو پھر عملی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور یہ بھی مشکل ہو تو وہ روایت قابل ترجیح ہوتی ہے، جس کا راوی فقیہ ہو۔ مثلاً عمرو بن دینار نے جابر بن زید ابو الشعثاء سے یہ روایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے بہ حالت احرام حضرت میمونہؓ سے شادی کی تھی۔ عمرو بن دینار نے جابر بن زید سے کہا کہ ابن شہاب زہری نے مجھے بتایا ہے کہ یزید بن الاصم نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہؓ سے جب شادی کی تھی اس وقت آپ ﷺ حالت احرام میں نہیں تھے۔ جابر بن زید نے جواب کہا کہ حضرت میمونہؓ ابن عباس کی خالہ تھیں۔ ان کے حالات سے وہ زیادہ باخبر تھے تو عمرو بن دینار نے اس کا جواب دیا کہ حضرت میمونہ یزید بن الاصم کی بھی خالہ تھیں۔ اس پر جابر

نے کہا یزید بن الاصم جو پیشاب کرنے میں احتیاط نہیں ملحوظ رکھتے تھے ان کا ابن عباس سے کیا مقابلہ؟

امام مالک تعارض واختلاف روایا کی صورت میں تعامل اہل مدینہ کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر کسی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔امام شافعیؒ اصحھما فی الباب کے قائل ہیں۔یعنی وہ باعتبار سند اہم اور قوی روایت کو قبول کرتے ہیں۔اور امام احمد بن حنبلؒ اس صورت میں اسلاف کے عمل کو حجت مان کر ترجیح وانتخاب کا معاملہ کرتے ہیں۔ان مناہج سے حدیث کی تحقیق میں بھی اور مسائل کے استخراج واستنباط میں بھی مدد ملتی ہے۔

آخر میں محدثین اور سیرت نگاروں کے مناہج تحقیق کے درمیان فرق بیان کر دینا مناسب ہے۔اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام ومسائل کو جاننا ہوتا ہے اور رسول کریم کی ذات گرامی سے ان کی بحث ضمناً یا التزاماً ہوتی ہے، جب کہ اصحاب سیرت کو مقصود بالذات رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے واقفیت فراہم کرنا ہوتا ہے اور احکام ومسائل سے ان کی بحث ضمناً ہوتی ہے، محدثین رواۃ کی ثقاہت عدل، تقویٰ اور دیانت کی کمی وزیادتی کی بنیاد پر روایتوں میں اختلاف کے وقت مقبول روایتوں کو ترجیح دیتے ہیں اور اصحاب سیرت حالات کی موافقت اور واقعات کے علم کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں، اور جب قولی اور عملی روایات میں اختلافات نظر آئے تو اصولیین قولی روایت کو عملی روایت پر ترجیح دیتے ہیں۔

علم حدیث میں علم اسماء الرجال اور جن جرح وتعدیل کے ضوابط کی تعیین سے دوسرے علوم میں تنقید وتحقیق کی راہ آسان ہوتی ہے۔علم حدیث کے ان بے مثال اصولوں سے علم الانسان، علم العمران اور علم الاجتماع ہر جگہ استفادہ کیا جاسکتا ہے، علامہ شمس الدین ذہبی کی میزان الاعتدال فی نقد الرجال، علامہ ابن اثیر جزری کی جامع الاصول، حافظ ابن حجر عسقلانی کی تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب اور لسان المیزان، حافظ منذری کی تذکرۃ الحفاظ وغیرہ اس فن کی متداول کتابیں ہیں جن کو رہ نما کتب کہا جاسکتا ہے۔

حوالہ وحواشی

۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ سنت کی آئینی حیثیت۔ طبع لاہور ۱۹۸۶ء: ص ۵۹
۲۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی۔ السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی۔ طبع قاہرہ ۱۳۸۰ھ: ص ۱۰۶
۳۔ الحجرات: ۶
۴۔ النساء: ۸۳
۵۔ بخاری ومسلم
۶۔ مسلم مقدمہ۔ باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۷۔ بخاری۔ کتاب المناقب
۸۔ مسند ابوداؤد الطیالسی۔ مسند عائشہ
۹۔ مسلم۔ کتاب الطلاق
۱۰۔ مولانا مناظر حسن گیلانی۔ تدوین حدیث۔ طبع کراچی ۱۹۵۶ء: ص ۵۳
۱۱۔ ابن حجر العسقلانی۔ نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر۔ طبع دہلی ۱۹۰۲ء: ص ۱۲
۱۲۔ مسلم۔ مقدمہ۔ باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء
۱۳۔ خطیب بغدادی۔ کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ۔ طبع حیدرآباد ۱۳۹۰ء: ص ۱۶۲
۱۴۔ معرفۃ علوم الحدیث۔ دار الکتب المصریہ ۱۳۹۷ھ: ص ۶
۱۵۔ تدوین حدیث: ص ۵۴
۱۶۔ کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ: ص ۱۷۸
۱۷۔ تدریب الراوی۔ طبع مصری ۱۳۸۵ء: ج ۱، ص ۲۹۸
۱۸۔ ابن تیمیہ۔ کتاب الوسیلہ۔ مترجم: عبدالرزاق ملیح آبادی۔ کریمی پریس لاہور ۱۹۲۵ء: ص ۱۳۰، ۱۳۱
۱۹۔ تفسیر ابن کثیر۔ طبع دار الفکر ۱۹۸۰ء: ج ۱، ص ۱۶۸
۲۰۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی۔ مقدمہ اوجز المسالک۔ طبع لکھنؤ
۲۱۔ کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ: ص ۱۵۸
۲۲۔ النور:
۲۳۔ ابن قیم۔ المنار المنیف۔ طبع حلب ۱۹۸۰ء۔ ملا علی قاری۔ موضوعات کبیر۔ طبع مصر ۱۲۸۹ء
۲۴۔ المنار المنیف: ص ۴۴
۲۵۔ تفسیر ابن کثیر: ج ۱، ص ۱۴۰